OPEN ACCESS: "*EPISTEMOLOGY"*
eISSN: 2663-5828;pISSN: 2519-6480
Vol.11 Issue 12 December 2022

اُسلوب تقدیم وتاخیر اور تنوع معانی قرآن

STYLE OF PREPOSITIONAL AND POSTPOSITIONAL AND DIVERSE MEANINGS OF THE HOLY QURAN

Shafiq ur Rehman
Lecturer, Government Islamia Graduate College Railway Road, Lahore.

Abstract: The Holy Quran was revealed in the mother language of the Arabs. The miracle of this book, addressing the native speakers in their own language, is that the words and methods to which the people of Makkah were well aware, the Holy Quran used the same words and styles in such a beautiful manner as the listeners felt dumb before it. Arabic, among other world languages, has a unique status owing to its linguistic and meaning related qualities. One of the characteristics of Arabic language used in the Holy Quran is the style of prepositional and postpositional of words in a sentence element. In any sentence, the prepositional and postpositional styles are adopted to achieve a lexical and semantic advantage. The style of prepositional and postpositional is used in both Arabic prose and poetry. It enables the speaker or writer to precede whatever he wishes for the purpose of meaning or order of importance or chronological order. This style is also used in many verses of the Holy Quran. Whenever the Holy Quran adopts this style of speech, it is not just a coincidence, but there is a strong reason behind it and it has several semantic and lexical impacts and advantages. One aspect of prepositional and postpositional is that sometimes by recognizing this style in a Quranic composition, we get more meaning from a verse

and this additional meaning would not conflict with the meaning which is the known meaning of the verse.

Keywords: Holy Quran, miracle, prepositional, postpositional, prose, poetry, chronological order, semantic, lexical, Quranic composition.

تقدیم وتاخیر سے مراد کسی کلمہ کا اپنے اُصلی اور حقیقی مقام سے پہلے یا بعد میں ذکر کرنا کے ہیں۔کلام کی حقیقی اور اُصلی ترتیب میں اس تبدیلی کا اہم سبب کسی لفظی و معنوی حکمت کا حصول ہوتا ہے۔ متکلم جب یہ چاہتا ہے کہ وہ کلام میں کسی لفظ کا اُضافہ کیے بغیر اُس سے ایک زائد معنٰی حاصل کر لے تو وہ اِس اُمر کے حصول کے لیے کلمات کی ترتیب اُصلیہ میں تبدیلی کر دیتا ہے چنانچہ اِس عمل سے وہ ایک ایسے معنٰی تک پہنچ جاتا ہے کہ بسا اُوقات جس تک رسائی کلام میں میں اُلفاظ کی زیادتی سے بھی ممکن نظر نہیں آتی۔کلام میں کلمات کی ترتیب میں تبدیلی کا یہ اُسلوب اُن لوگوں کے ہاں عام مروج اور مستعمل تھا جو کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب تھے۔اِن مخاطبین کو اپنی زبان اور اُسلوب بیان پر بڑا ناز تھا۔یہ اپنی موزوں طبائع کی بابت اپنے خیالات اور جذبات کو نظم و نثر کے مختلف طرق واُسالیب میں بیان کرتے تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنی لسانی ریاضت اور کہنہ مشق اُوصاف کے سبب اس زبان کو لفظی حسن و شوکت کا مرقع بنا دیا تھا۔پس جب قرآن کریم نے اُن سے مخاطبت کی تو اِس کلام معجز نے نہ صرف اُن کی زبان کو اُپنایا بلکہ اُن اُسالیب اور طرق کا بھی استعمال کیا جو کہ اُن کے ہاں مروج اور مستعمل تھے۔قرآن کریم نے جن مروجہ مناہج کلام کو اختیار کیا اُن میں سے ایک کلمات کی ترتیبی نشست میں تبدیلی کا یہ اُنداز بھی ہے۔قرآن مجید میں اِس اُسلوب کا استعمال مسلم اور واضح ہے۔اُلبتہ اِس طرز کلام کا مختلف جہتوں اور اُطراف سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس کا ایک پہلو اور جہت یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ قرآنی آیات میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کو تسلیم کرنے سے معانی میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی قرآنی آیت کا ایک وہ مفہوم ہوتا ہے جو کہ آیت کے اُلفاظ کو اپنے اُصل اور سادہ اُسلوب پر رکھتے ہوئے مستفاد ہو رہا ہوتا ہے۔جبکہ دوسری طرف اگر نظم اور سیاق کلام میں تقدیم وتاخیر کو تسلیم کرنے کی گنجائش موجود ہو تو اِس اُسلوب کے تسلیم کرنے سے کلام میں ایک زائد معنٰی پیدا ہو جائے گا جیسا کہ ذیل میں ذکر ہونے والی قرآنی اُمثلہ سے اِس اُمر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اُسلوب تقدیم وتاخیر سے قرآن میں تنوع معنوی کی اُمثلہ:

قرآن حکیم میں ہے:

الف: [أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ][1]

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہارے اوپر ویسے حالات نہیں آئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے، اُن کو تنگی اور سختی پیش آئی اور انہیں ہلا دیا گیا یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے پکار اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی، سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے"

مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ تمام اسلام دشمن قوتیں یکجا ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئیں۔ ایک طرف مشرکین مکہ اپنے الاؤ لشکر کے ساتھ مدینہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے تو دوسری طرف مدینہ میں آباد یہود اور منافقین کی مشرکین سے ساز باز نے حالات کو مزید سنگین بنا دیا۔ اَندرونی اور بیرونی دشمن کی موجودگی میں بے سر سامانی اور موسم کی شدت جیسے دیگر عوامل نے مسلمانوں کی تشویش اور اضطراب کو مزید بڑھا دیا۔ چنانچہ اس پریشان کن صورت حال نے مسلمانوں کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہ بے ساختہ پکار اٹھے۔ کہ اللہ کی مدد آخر کب آئے گی؟ اِس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت اور وعدہ یہ ہے کہ جب اُس کے فرمانبردار بندوں پر دشمن کی طرف سے تکالیف اور مصائب ایک حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو پھر اُس کی مدد اور نصرت ضرور آکر رہتی ہے۔

اَکثر مفسرین نے چونکہ مذکورہ آیت کی تفسیر کی بابت کلمات آیت کو اپنے ظاہر پر ہی محمول کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے رسول اور اہل ایمان دونوں کو متی نصر اللہ کے اَلفاظ کا قائل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اُن کی اس پکار پر انہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف اُس کی نصرت کے عنقریب پہنچنے کی نوید سنائی جا رہی ہے اور اہل ایمان کو تاکید کی جا رہی ہے کہ وہ دشمن کی طرف سے پہنچنے والی اِن تکالیف اور مصائب پر ثابت قدم رہیں۔ اس لیے کہ ایمان والے جن مراتب کے خواہاں ہیں اُن کا راستہ اِسی قسم کے ناموافق حالات اور آزمائشوں سے ہو کر ہی جاتا ہے۔

جبکہ دوسری طرف بعض مفسرین کی رائے یہ بھی ہے کہ یہاں کلام تقدیم وتاخیر کے اُسلوب میں ہے، لہذا اِن کے ہاں متی نصر اللہ کے اَلفاظ کا تعلق رسول کے علاوہ محض اہل ایمان سے ہے۔ قاضی ابن عطیہ الاندلسی (م: ۵۴۲ھ) مذکورہ دونوں آراء کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وأكثر المتأولين على أن الكلام إلى آخر الآية من قول الرسول والمؤمنين، ويكون ذلك من قول الرسول على طلب استعجال النصر لا على شك ولا ارتياب، والرَّسُولُ اسم الجنس، وذكره الله تعظيما للنازلة التي دعت الرسول إلى هذا القول، وقالت طائفة: في الكلام تقديم وتأخير، والتقدير حتى يقول الذين آمنوا متى نصر الله فيقول الرسول أَلا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ، فقدم الرسول في الرتبة لمكانته ثم قدم قول المؤمنين لأنه المتقدم في الزمان. "[2]

"اور اکثر متاولین کا خیال یہ ہے کہ آیت کے آخر تک کلام رسول اور ایمان والوں کے قول سے متعلق ہے اور یہاں رسول کا مدد کو طلب کرنا شک اور ارتیاب کی بنا پر نہیں بلکہ اُس کے جلدی حصول کے لیے ہے، لفظ رسول اسم جنس ہے اور کلام میں اس کا ذکر تعظیم کی غرض سے ہے جبکہ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہاں کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، لہذا تقدیر کلام اس طرح سے ہے یہاں تک کہ جب ایمان والے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد آخر کب آئے گی؟ تو رسول نے کہا کہ اللہ کی مدد بس آیا ہی چاہتی ہے۔ ترتیب کلام میں لفظ رسول کی تقدیم رتبہ اور شرف کے سبب ہے، پس مومنین کا قول پہلے اس لیے مذکور ہے کیونکہ وہ زمانی ترتیب میں مقدم ہے۔"

البتہ جہاں تک مذکورہ سیاق میں تقدیم وتاخیر کو تسلیم کرنے سے پیدا ہونے والے اس شبہ کا تعلق ہے کہ آخر وہ کونسا سبب ہے کہ جس کے پیش نظر مفسرین کی ایک جماعت نے یہ رائے قائم کی ہے؟ تو علامہ آلوسی (م: ۱۲۷۰ھ) اس وجہ اور سبب کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" وتنبيه على أن الرسول قال لهم في جوابهم وبأن منصب الرسالة يستدعي تنزيه الرسول عن التزلزل لا ينبغي أن يلتفت إليه "[3]

''اور یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ رسول کا قول مومنین کے جواب میں ہے اس لیے کہ منصب رسالت اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ تزلزل سے پاک ہے، لہذا رسول کی طرف اِس کی نسبت مناسب نہیں ہے''

پس کلام میں تقدیم وتاخیر کے تسلیم کرنے سے تقدیر عبارت کچھ اس طرح سے ہو گی، حتی یقول الذین آمنوا متی نصر اللہ ؟ فیقول الرسول ألا ان نصر اللہ قریب ۔ تو گویا تحویل کلمات کے اس اُسلوب کے سبب سیاق مذکور سے ایک زائد معنٰی حاصل ہو گیا اور وہ معنٰی یہ ہے کہ جب اہل ایمان نے خدائی نصرت سے متعلق استفسار کیا تو اللہ کے رسول نے اُن کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس اللہ کی مدد عنقریب پہنچنے والی ہے۔

ب :[يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ][4]

''اے ایمان والو ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر اُن کی حقیقیت تم پر ظاہر کر دی جائے تو تمہیں بری لگے اور اگر قرآن کے نازل ہونے کے زمانے میں ایسی باتیں پوچھو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی''

اِس آیت کے شان نزول کے ذیل میں مفسرین نے چند بے موقع اور بے محل سوالات کا تذکرہ کیا ہے، جیسا کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے ؟ اِسی طرح سے ایک موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے حج کی فرضیت کو بیان کیا تو ایک صحابی پوچھنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ کیا حج ہر سال فرض ہے ؟ آپ ﷺ نے اس سوال کے جواب میں سکوت اختیار فرمایا یہاں تک کہ اُس صحابی نے اس سوال کو تین بار دہرایا، تو اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میں خود کسی بات کو بیان کر رہا ہوتا ہوں تو تم اپنی طرف سے اس بات کو مت پوچھا کرو۔

آیت کے اُبتدائی حصہ میں اہل ایمان کو ایسے ہی بے موقع سوالات کے استفسار سے روکا جا رہا ہے، لہذا یہاں اشیاء کا کلمہ عام ہے جو واقعات اور اَحکام دونوں کو شامل ہے۔ چنانچہ حکم یہ ہے کہ اہل ایمان کو ایسے سوالات سے اجتناب کرنا چاہیے جو محض بال کی کھال اتارنے کے مترادف ہوں، کیونکہ اگر وہ اس قسم کے سوالات کریں گے تو اُس کے جواب میں

ممکن ہے کہ کوئی نیا حکم نازل ہو جائے یا حکم سابق میں کسی قید کا اُضافہ کر دیا جائے یا پھر کسی راز کی پردہ دری کر دی جائے تو اس میں اُن کے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔

البتہ جہاں تک مذکورہ آیت کے حوالے سے اُسلوب تقدیم وتاخیر کا تعلق ہے تو اس بابت حضرات مفسرین سے دونوں طرح کی آراء منقول ہیں۔ جمہور مفسرین کلمات آیت کو اپنی اُصل ترتیب پر ہی محمول کرتے ہیں جبکہ بعض اہل فن تقدیم وتاخیر کے قائل ہیں۔امام قرطبیؒ (م:۶۷۱ھ)اِن آراء کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وَالْكَلَامُ عَلَى هَذَا التَّقْدِيرِ فِيهِ تَقْدِيمٌ وَتَأْخِيرٌ، أَيْ لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ، أَيْ أَمْسَكَ عَنْ ذِكْرِهَا فَلَمْ يُوجِبْ فِيهَا حُكْمًا. وَقِيلَ: لَيْسَ فِيهِ تَقْدِيمٌ وَلَا تَأْخِيرٌ، بَلِ الْمَعْنَى قَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْ مَسْأَلَتِكُمُ الَّتِي سَلَفَتْ وَإِنْ كَرِهَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَا تَعُودُوا لِأَمْثَالِهَا. فَقَوْلُهُ:" عَنْهَا" أَيْ عَنِ الْمَسْأَلَةِ، أَوْ عَنِ السُّؤَالَاتِ كَمَا ذَكَرْنَاهُ. السَّابِعَةُ- "[5]

"اور کلام اس تقدیر کی بناء پر تقدیم وتاخیر کے اُسلوب میں ہے، یعنی کہا یہ جارہا ہے کہ تم ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں، پس جب خود اُس نے اِن چیزوں میں کوئی حکم نہیں دیا تو اَب ان میں کوئی حکم ثابت نہیں ہے۔ اور بعض علماء کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ کلام تقدیم وتاخیر کی بجائے سادہ اُسلوب میں ہے لہذا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس مسئلہ سے در گزر فرمایا ہے جو کہ پہلے گزر چکا ہے اگرچہ اُس مسئلہ کو نبی اکرم ﷺ نے بھی ناپسند فرمایا ہو، چنانچہ اَب تم ایسے مسائل کے استفسار سے اجتناب کرو۔ پس عنہا کی ضمیر کا مرجع مسئلہ ہے یا پھر سوالات ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ آیت میں اُسلوب تقدیم وتاخیر کے ماننے سے ہمیں ایک زائد معنیٰ حاصل ہو گیا اور وہ معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن باتوں کو ذکر نہیں فرمایا، یعنی اِن باتوں سے در گزر کیا ہے سو جب ان چیزوں میں کوئی حکم ثابت نہیں ہے تو اَب تم اِن باتوں میں آزاد ہو۔ جبکہ دوسری طرف کلام کو اگر اپنے اُصل اور سادہ اُسلوب پر ہی رکھا جائے تو پھر عفا اللہ

عنها سے لم یواخذ بها کے معنیٰ مراد ہوں گے اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ ماضی میں پوچھے جانے والے اس قبیل کے سوالات کو معاف کر دیا ہے، لہذا اَب وہ اِن سابقہ فرسودہ سوالات پر مؤاخذہ نہیں کرے گا۔

ج :[فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ][6]

''آپ اُن کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کریں، اللہ یہی چاہتا ہے کہ انہیں ان چیزوں کے سبب دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور اُن کی جان اِس حال میں نکلے کہ وہ کافر ہی ہوں''

اہل ایمان جب منافقین کے ہاں مال و اَولاد کی کثرت اور اس بہتات پر اُن کے متکبرانہ رویہ کو دیکھتے تو اُن کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ جب یہ لوگ عند اللہ مغضوب اور مردود ہیں تو پھر اِنہیں یہ نعمتیں اس قدر میسر کیوں ہیں؟ قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت اس شبہ کو اس طرح سے زائل کر رہی ہے کہ منافقین کے ہاں اِن نعمتوں کا ہونا در حقیقت اللہ تعالیٰ کے قانون امہال اور استدراج کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ کلام مذکور کو اپنی مألوف ترتیب پر رکھتے ہوئے اس سے جو مفہوم اَخذ ہو رہا ہے وہ یہی ہے کہ منافقین کے ہاں اِن نعمتوں کا وجود در اَصل اُن کے لیے راحت و سکون کی بجائے عذاب اور اَذیت کا باعث ہے۔ وہ اس طرح سے کہ ہر لمحہ ان کو یہ فکر ستائے رہتی ہے کہ یہ دنیوی مال و اَسباب کہیں ان سے چھن نہ جائیں۔ اِن کا یہ مال کسی خسارے اور ان کی اَولاد کسی مہلک بیماری کی نظر نہ ہو جائے یا پھر ان کی اَولاد اِن کے مرنے کے بعد ان کے مال اَسباب کو ضائع نہ کر دے۔ پس یہ وہ خدشات ہیں کہ جنہوں نے ان کی دنیوی زندگی کو اَجیرن بنا رکھا ہے۔

جبکہ دوسری جانب ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت تقدیم وتاخیر کے اُسلوب میں ہے، لہذا اس صورت میں فی الحیوۃ الدنیا کے اَلفاظ کا تعلق آیت کے پہلے حصہ سے ہو گا۔ چنانچہ اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح سے ہو گی، فلا تعجبک أموالهم ولا أولادهم فی الحیاة الدنیا انما یرید الله لیعذبهم بها فی الآخرة ۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی (م:۱۲۲۵ھ) اِس رائے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وقال مجاهد وقتادة فی الآیة تقدیم وتأخیر تقدیرها فلا تعجبك أموالهم ولا أولادهم فی الحیوة الدنیا انما یرید الله ان یعذبهم بها فی الآخرة علی کسبها وجمعها وحفظها وإنفاقها علی وجه غیر مشروح ."[7]

''مجاھد اور قتادۃ کے ہاں کلام میں تقدیم وتاخیر ہے لہذا اُصل عبارت اس طرح سے ہے کہ اُن کی اُموال اور اولاد کی کثرت آپ کو دنیا کی زندگی میں دھوکہ میں نہ ڈالے، کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ مال کو کمانے، جمع کرنے، محفوظ بنانے اور اُسے ناجائز کاموں پر خرچ کرنے کے سبب اُنہیں آخرت کے عذاب میں مبتلاء کرے''

پس پتہ چلا کہ جب کلمات آیت کو اپنی اُصل ترتیب پر باقی رکھا جائے تو پھر معنیٰ یہ اُخذ ہو گا کہ یہ مال و اُولاد کی کثرت جو بظاہر بڑی دلکش نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ اُن کی دنیوی زندگی کے لیے موجب عذاب بنی ہوئی ہے۔ اُلبتہ دوسری طرف جب اِن کلمات کے مابین تقدیم وتاخیر کو تسلیم کیا گیا تو پھر اس سے جو مفہوم مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مال اور اُولاد کے سبب وارد ہونے والے عذاب کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور فی الحیوۃ الدنیا کے الفاظ آیت کے ابتدائی حصہ سے متعلق ہیں۔ چنانچہ مدعا اور مقصود یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں کفار و منافقین کے ہاں مال واُولاد کی کثرت آپ کے لیے باعث تعجب نہیں ہونی چاہیے۔اس لیے کہ اِن کے ہاں اِن نعمتوں کا میسر آنا در اُصل اللہ تعالیٰ کے قانون امہال کے نتیجہ میں ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مال و اُسباب آخرت میں ان کے لیے موجب عذاب ہیں۔

د : [الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا][8]

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اِس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں رکھی، ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کرنے والی کتاب''

نص قرآنی کا یہ حصہ کلام مجید کی دو نمایاں خصوصیات کو بیان کر رہا ہے۔ کتاب حکمت کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ کسی بھی قسم کے لفظی اور معنوی تعارض و تناقض سے پاک کتاب ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا امتیاز اس کا قیم ہونا ہے۔ اُب جہاں تک لفظ قیم کے معنیٰ اور مدلول کا تعلق ہے تو مفسرین کی ایک جماعت نے اس کے معنیٰ محافظ اور نگران ہونے کے کیے ہیں۔ یعنی یہ کتاب ایسی ہے جو کہ کتب سابقہ کی محافظ ہے سو یہ اُن کی درست باتوں کی تائید کرنے والی اور اُن میں واقع تحریفات کا انکار کرنے والی ہے۔اس موقف کے قائلین کے ہاں مذکورہ آیت اپنی مألوف ترتیب پر وارد ہے اور لفظ قیماً کا منصوب ہونا فعل محذوف کے سبب ہے۔

امام قرطبیؒ (م:۶۷۱ھ) اس رائے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَقَالَ قَتَادَةُ: الْكَلَامُ عَلَى سِيَاقِهِ مِنْ غَيْرِ تَقْدِيمٍ وَلَا تَأْخِيرٍ، وَمَعْنَاهُ:وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ قيما."[9]

"قتادہ کا قول یہ ہے کہ کلام اپنے سیاق پر ہے اور یہ تقدیم وتاخیر سے خالی ہے، اور اس کا معنٰی یہ ہے کہ اِس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور ہم نے اِسے درست کرنے والا بنایا ہے"

اُلبتہ دوسری طرف ایک مؤقف یہ بھی ہے کہ کلام مذکور تقدیم وتاخیر کے اُسلوب میں ہے، لہذا ان حضرات کے ہاں لفظ قیم، الکتاب سے حال واقع ہے اور اس کے معنٰی مستقیم اور سیدھا ہونے کے ہیں، جیسا کہ ابن جریر طبری (م:۳۱۰ھ) اِس رائے کو نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" عن ابن عباس، في قوله:(وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجَا قَيِّمًا) يقول: أنزل الكتاب عدلا قيما، ولم يجعل له عوجا، فأخبر ابن عباس بقوله هذا مع بيانه معنى القيم أن القيم مؤخر بعد قوله، ولم يجعل له عوجا، ومعناه التقديم بمعنى: أنزل الكتاب على عبده قيما."[10]

"ابن عباسؓ سے اللہ تعالٰی کے اس فرمان (اور اِس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں رکھی، ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کرنے والی کتاب) کی بابت منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے اس کتاب کو اس طرح سے نازل کیا ہے کہ یہ سیدھی اور مستقیم ہے اور اس میں کوئی کجی نہیں ہے، حضرت ابن عباس نے قیم کے معنٰی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہاں قیم کا لفظ لم یجعل له عوضا سے لفظاً مؤخر ہے جبکہ معنًا مقدم ہے لہذا تقدیر عبارت اس طرح سے ہے کہ اُس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری ہے اس حال میں کہ وہ سیدھی ہے"

پس معلوم ہوا کہ کلام کو اگر اپنی اُصل ترتیب پر باقی رکھا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور ہم نے اِسے درست کرنے والا بنایا ہے۔ جبکہ دوسری جانب تقدیم وتاخیر کے تسلیم کرنے سے معنٰی یہ ہوں گے کہ یہ سیدھی اور مستقیم کتاب ہے اور اس میں کوئی کجی اور جھول نہیں ہے۔

ھ :　　[لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى][11]

"تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں آپ کو دکھادیں"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتمام حجت کی خاطر متعدد معجزات عطا فرمائے گے تھے۔ اُن میں سے دو کا قرآن کریم نے یہاں بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ایک نشانی عصا موسوی[12] کا سانپ کی شکل اختیار کر لینا اور دوسری ید بیضا[13] کی صورت میں ہے۔

مذکورہ بالا آیت سیاق میں مذکور اِن معجزات کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دے رہی ہے۔ البتہ جہاں تک اس مضمون پر مشتمل کلمات کی بطور جز جملہ ترتیب کا تعلق ہے تو جمہور مفسرین نے اسے اپنی اُصل پر باقی رکھتے ہوئے من آیاتنا کے اُلفاظ کو لنریک فعل کے لیے مفعول ثانی اور کلمہ الکبری کو من آیاتنا کی صفت قرار دیا ہے۔

علامہ آلوسی (م:۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

" فعلنا ما فعلنا لنريك بعض آياتنا الكبرى على أن الْكُبْرى صفة لآياتنا على حد مَآرِبُ أُخْرى ومِنْ آياتِنَا في موضع المفعول الثاني "[14]

"ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ ہم آپ کو اپنی بعض بڑی نشانیاں دکھائیں، پس ترکیب میں الکبری کا لفظ آیاتنا کی صفت واقع ہے اور من آیاتنا کے اُلفاظ نریک فعل کے لیے مفعول ثانی کی جگہ پر ہیں"

پس اس صورت میں کلام سے جو معنیٰ اُخذ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو جتنی بھی خارق عادات نشانیاں عطا ہوئی تھیں وہ سب اپنی اپنی جگہ پر بڑی تھیں، البتہ سیاق میں جن کا تذکرہ ہوا ہے وہ اُن میں سے اُکبر یعنی غیر معمولی حثیت کی حامل تھیں۔ جیسا کہ علامہ اُبو حیان الاندلسی (م:۷۴۵ھ) لکھتے ہیں:

" وَالَّذِي نَخْتَارُهُ أَنْ يَكُونَ مِنْ آياتِنَا فِي مَوْضِعِ الْمَفْعُولِ الثَّانِي، والْكُبْرى صِفَةً لِآيَاتِنَا لِأَنَّهُ يَلْزَمُ مِنْ ذَلِكَ أَنْ تَكُونَ آيَاتُهُ تَعَالَى كُلُّهَا هِيَ الْكُبَرَ لِأَنَّ مَا كَانَ بَعْضَ الْآيَاتِ الْكُبَرِ صَدُقَ عَلَيْهِ أَنَّهُ الْكُبْرى. "[15]

"اور جس رائے کو ہم نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ من آیاتنا مفعول ثانی کے محل میں ہے اور کلمہ کبری اس کے لیے صفت واقع ہے، سو اس سے معنیٰ یہ نکلتا ہے کہ سب نشانیاں اپنی حثیت اور جگہ پر بڑی ہیں البتہ اُن میں سے بعض ایسی بھی ہیں کہ جن پر الکبری کا اطلاق ہوتا ہے"

جبکہ دوسری طرف بعض اہل علم نے کلام کو تقدیم وتاخیر کے اُسلوب میں لیا ہے، لہذا ان کے تقدیر عبارت لنریک الکبری من آیاتنا کی صورت میں ہے۔ اُبو حیان الاندلسی (م:۷۴۵ھ) اس موقف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَإِذَا جَعَلْتَ الْكُبْرى مَفْعُولًا لَمْ تَتَّصِفِ الْآيَاتُ بِالْكُبَرِ لِأَنَّهَا هِيَ الْمُتَّصِفَةُ بِأَفْعَلِ التَّفْضِيلِ، وَأَيْضًا إِذَا جَعَلْتَ الْكُبْرى مَفْعُولًا فَلَا يُمْكِنُ أَنْ يَكُونَ صِفَةً لِلْعَصَا وَالْيَدِ مَعًا لِأَنَّهُمَا كَانَ يَلْزَمُ التَّثْنِيَةُ فِي وَصْفَيْهِمَا فَكَانَ يَكُونُ التَّرْكِيبُ الْكُبْرَيَيْنِ وَلَا يُمْكِنُ أَنْ يُخَصَّ أَحَدُهُمَا لِأَنَّ كُلًّا مِنْهُمَا فِيهَا مَعْنَى التَّفْضِيلِ."[16]

"اور جب آپ لفظ الکبری کو مفعول بنائیں گے تو پھر سب آیات کا صفت کبر سے متصف ہونے کی بجائے کوئی ایک ہی اس کا مصداق قرار پائے گی، اسی طرح سے جب کلمہ الکبری مفعول بنے گا تو پھر ید اور عصا پر ایک ہی وقت میں اس کا اطلاق نہیں ہو گا اس لیے کہ ان دونوں کی صفت بننے کے لیے اس کا تثنیہ کی حالت میں ہونا ضروری تھا چنانچہ ایسا ہونے کی صورت میں الکبری کی بجائے اسے الکبریین کی صورت میں ہونا چاہے تھا اس لیے کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو خاص کیا جا سکے"

کلام مذکور میں دونوں اُسالیب کے باہم موازنہ سے معنٰی پر مرتب ہونے والا اُثر اس طرح سے ظاہر ہو گا کہ لفظ الکبری کو اپنے اُصل محل پر رکھنے سے معنٰی یہ پیدا ہو گا کہ حضرت موسیٰؑ کو عطا ہونے والے معجزات سب اپنی اپنی حیثیت میں بڑے ہیں، اُلبتہ یہاں اُن میں سے اُکبر کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف لفظ الکبری کو مقدم ماننے سے معنٰی یہ بنے گا کہ ہم اپنی نشانیوں میں سے بڑی نشانی آپ کو دکھاتے ہیں، سو اس طرح سیاق میں مذکور کے علاوہ باقی ماندہ نشانیوں سے کبر اور بڑائی کی نفی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس صورت میں الکبری کا تعلق ایک وقت میں سیاق میں مذکور دو معجزات میں سے کسی ایک سے ہو گا۔

و: [إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا • فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا • فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا • وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا •][17]

''جب اُن کا سب سے سرکش شخص اٹھ کھڑا ہوا، تو اللہ کے پیغمبر نے قوم سے کہا کہ اللہ کی اونٹنی اور اُس کے پانی پینے کا پورا پورا خیال رکھنا۔ پھر بھی انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اُس اونٹنی کو مار ڈالا پس اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پروردگار نے اُن کے گناہ کی وجہ سے اُن کی اینٹ سے اینٹ بجا کر سب کو برابر کر دیا۔''

حضرت صالح علیہ السلام کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کی چٹان سے ایک اونٹنی تخلیق فرما دی۔ یہ اونٹنی جس طرح اپنی پیدائش میں عجیب و غریب تھی اُسی طرح سے اس کے لوازم اور اُوصاف بھی غیر معمولی نوعیت کے تھے۔ وہ کنواں جس سے ساری قوم کے مویشی سیر ہوتے تھے یہ اونٹنی اکیلے ہی اُسے چٹ کر دیتی تھی۔ قوم نے جب اس پر ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت صالحؑ نے باری مقرر کر دی کہ ایک دن بستی والے اس کنوئیں سے فائدہ اٹھائیں گے اور دوسرے دن اکیلی اونٹنی اس سے پانی پیے گی۔

قوم نے حسب روایت اپنی سرکشی اور نافرمانی کے سبب اس اونٹنی کو اپنے لیے باعث تکلیف جانا۔ چنانچہ وہ اس تکلیف سے نجات کے لیے اس اونٹنی کے قتل کے درپے ہو گے۔ حضرت صالحؑ نے انہیں اس مذموم اُرادے سے باز رکھنے کے لیے بارہا نصیحت کی کہ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے، لہذا تم اسے اپنے حصہ کا پانی پینے دو اور اِسے کسی بھی طرح سے نقصان مت پہنچاؤ۔ لیکن قوم نے مصلح وقت کی نصیحت پر کان نہ دھرے اور آخر کار اس اونٹنی کو قتل کر دیا۔ یہ اونٹنی چونکہ قوم ثمود کی سرکشی کو ماپنے کا آخری معیار تھا، لہذا جب قوم نے یہ حد عبور کی تو اللہ نے اُن پر ہلاکت خیز عذاب مسلط کر دیا اور یوں اُن کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

پس جہاں تک مذکورہ آیات میں اُلفاظ کی ترتیب کا تعلق ہے تو جمہور مفسرین نے کلمات تراکیب کو اپنے محل پر رکھتے ہوئے لا یخاف عقبها میں فعل نفی لا یخاف کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں اِس ترکیب سے معنٰی یہ اُخذ ہو گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات انجام سے نہیں ڈرتی۔ اس لیے کہ دنیا کے حکمران جب کسی قوم اور گروہ کے خلاف جب کوئی بڑا فیصلہ کرنے لگتے ہیں تو انہیں قوم کی طرف سے ملامت اور بغاوت کا خوف رہتا ہے۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا معاملہ مختلف ہے۔ چنانچہ اُسے اِن مجرمین کی طرف سے کسی بھی قسم کے رد عمل اور انتقام کا کوئی خوف نہیں ہے۔

علامہ آلوسی (م: ۱۲۷۰ھ) اِس رائے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وَلا يَخافُ أي الرب عز وجل عُقْباها أي عاقبتها وتبعتها كما يخاف المعاقبون من الملوك عاقبة ما يفعلونه وتبعته. وهو استعارة تمثيلية لإهانتهم وأنهم أذلاء عند الله جل جلاله والواو للحال أو للاستئناف، "[18]

"اور اللہ تعالیٰ کی ذات انجام اور رد عمل سے نہیں ڈرتی جیسا کہ دنیا کے حکمران اپنے فیصلوں کے انجام اور رد عمل سے ڈرتے ہیں، پس یہ استعارہ تمثیلیہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں متمردین کی اہانت اور عجز کو ظاہر کر رہا ہے اور یہاں ترکیب میں واقع واؤ حالیہ ہے یا استینافیہ ہے"

جبکہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں لا يخاف کی ضمیر کا مرجع وہی باغی اور سرکش ہے کہ جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور اُس کے قتل کا سبب بنا، جیسا کہ امام قرطبیؒ (م: ۶۷۱ھ) نقل فرماتے ہیں:

" قَالَ السُّدِّيُّ وَالضَّحَّاكُ وَالْكَلْبِيُّ: تَرْجِعُ إِلَى الْعَاقِرِ، أَيْ لَمْ يَخَفِ الَّذِي عَقَرَهَا عُقْبَى مَا صَنَعَ. وقال ابْنُ عَبَّاسٍ أَيْضًا. وَفِي الْكَلَامِ تَقْدِيمٌ وَتَأْخِيرٌ، مَجَازُهُ: إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا."[19]

"سدی، ضحاک اور کلبی کی رائے یہ ہے کہ یہ ضمیر عاقر کی طرف راجع ہے، یعنی وہ سرکش شخص جس نے کونچیں کاٹی تھیں وہ اس فعل بد کے انجام سے نہیں ڈرا۔ ابن عباس کی بھی یہی رائے ہے کہ یہاں کلام میں تقدیم وتاخیر ہے لہذا تقدیر عبارت اس طرح سے ہے کہ وہ سرکش کھڑا ہوا اور وہ انجام سے نہیں ڈرا"

پس معلوم ہوا کہ فعل نفی لا يخاف کی ضمیر کا مرجع عاقر کو تبھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ جب اس میں تقدیم وتاخیر کو تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ اِس اُسلوب اور طرز کو تسلیم کرنے سے ایک نیا معنیٰ حاصل ہو گیا جو کہ اِس طرح سے ہے کہ جب وہ سرکش باغی کھڑا ہوا تو وہ اپنے فعل بد کے انجام سے نہیں ڈرا۔

خلاصہ بحث:

قرآن کریم کی وجوہ اعجاز کا ایک اہم پہلو اور جہت اِس کے منتخب کردہ الفاظ کی تالیف، ترکیب اور ترتیب بھی ہے۔ قرآن مجید جس عرصہ میں نازل ہو رہا تھا یہ وہ دور ہے کہ اِس کے مخاطبین اول عربی نظم ونثر کی دنیا میں اس درجہ بام عروج پر

تھے کہ وہ اپنے آپ کو مجال السنۃ میں بے نظیر اور بے مثل سمجھتے تھے اور ہل من مبارز؟ کے دعویٰ دار تھے۔ قرآن مجید کا کمال یہ ہے کہ مدعا اور مقصود کو بیان کرنے کے لیے مخاطبین کے ہاں جو طرق و اُسالیب کلام مستعمل تھے اِس نے انہی مناہج اور طرق کو ایسے خوبصورت اَنداز کے ساتھ اختیار کیا ہے کہ اس منہج بیان کے سامنے مخاطبین کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں۔

قرآن کریم کے اختیار کردہ اُسالیب کلام و طرق کا ایک اَنداز جملہ میں اَلفاظ کی تقدیم و تاخیر کا عمل بھی ہے۔ تقدیم و تاخیر سے مراد کلام میں لفظی اور معنوی حکمت کے پیش نظر اَلفاظ کا اپنے نحوی اور اَصلی مقام سے پہلے یا مؤخر ہونا کے ہیں۔ کلام میں تقدیم و تاخیر کے اُسلوب کو اپنانے سے ترکیب میں اَلفاظ کی حقیقی اور عمومی نشست میں تبدیلی کا وقوع بالکل ظاہر ہے، یہی وجہ ہے کہ جس کی بابت علوم القرآن کے باب میں تقدیم و تاخیر کے مسئلہ کو عام طور پر معنوی خفا کی ایک وجہ اور سبب کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جو کہ اپنی جگہ پر ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ جبکہ دوسری طرف یہ اَمر بھی مسلم ہے کہ بسا اَوقات کلام میں تقدیم و تاخیر کے اُسلوب کے ماننے سے معنیٰ میں وسعت اور تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ اس معنوی تنوع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلام کا ایک وہ مدعا اور مفہوم ہوتا ہے جو کہ نظم کے اپنی اَصل ترتیب اور نسق پر رہتے ہوئے اَخذ ہو رہا ہوتا ہے جبکہ اُسی کلام میں جب قواعد و ضوابط کی رعایت کرتے ہوئے کسی لفظی یا معنوی قرینہ کی بناء پر تقدیم و تاخیر کے اُسلوب کو مانا گیا تو اُس سے کلام میں ایک زائد معنیٰ پیدا ہو گیا۔ آیت یا اُس کے جز سے حاصل ہونے والے اِس زائد معنیٰ کی بنیاد محض ذوق اور وجدان ہی نہیں ہوتا بلکہ اِس اُسلوب کو ماننے کے لیے لسانی قواعد و ضوابط کی رعایت بھی واجب ہے۔ مزید برآں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیت سے حاصل ہونے والا یہ معنوی تنوع اُس مدعا سے متصادم نہ ہو جو کہ آیت کا اَصل مصداق اور مراد ہے۔

حوالہ جات و حواشی

[1] ۔القرآن، البقرۃ، ۲:۲۱۴

Al-Qurʾān, Al-Baqaraḥ, 2:214

[2] ۔ابن عطیۃ الاندلسی، عبد الحق بن غالب، (م: ۵۴۲ھ)، المحرر الوجیز في تفسیر الکتاب العزیز، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۱، ۲۸۸/۱

Ibn Aṭiyah al-Andalusī, ʿBdal Ḥaq bin Ghalib, Al-Muḥarrar al-Wajīz fī tafsīr al-Kitāb al-ʿAzīz, Dār al-Kutub al-ʿIlmiyyah,Beirūt,2001,1:288

[3]۔آلوسی، محمود بن عبداللہ الحسینی (م:۱۲۷۰ھ) **روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی**، محقق: علی عبد الباری عطیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱/۴۹۸

Ālwsī,Mahmwd bin abdullaḥ, Rwḥ al-Mʿānī fī tafsīr al-Qurʾān al-ʿẒīm w al-sabʿ al-maṯānī, Dār al-Kutub al-ʿIlmiyyah,Beirūt,1:498

[4]۔القرآن، المائدۃ، ۵:۱۰۱

Al-Qurʾān, Al- Maʾidaḥ, 5:101

[5]۔القرطبی، شمس الدین محمد بن احمد (م:۶۷۱ھ) **الجامع لأحکام القرآن**، تحقیق: أحمد البیرونی وابراہیم أطفیش، دار الکتب المصریہ، القاھرۃ، مصر، ۱۹۶۴، ۶/۳۳۴

Al-Qurṯubī, Shams al Dīn Muhammad bin Āḥmād, Al-Jāmi li-Aḫkām al-Qurʾān,Dār al-Kutub al-Mi ṣryyaḫ,al-Qāhirḥ,Miṣr,1964ʾ,6:334

[6]۔القرآن، التوبۃ، ۹:۵۵

Al-Qurʾān, Al Taubḥ, 9:55

[7]۔پانی پتی، قاضی محمد ثناءاللہ (م:۱۲۲۵ھ) **تفسیر مظہری**، مکتبہ الرشیدیۃ، پاکستان، ۴/۲۲۸

Pānī Pati, Qāḍī Muḥammad Ṯanāʾ Allaḥ, Tafsīr Maẓhrī, Maktabḥ al- Rašīḍiyyaḥ, Pākistān, 4:228

[8]۔القرآن، الکھف، ۱۸:۱، ۲

Al-Qurʾān, Al-Kahaf,18:1,2

[9]۔الجامع لاحکام القرآن، ۱۰/۳۵۱

Al-Jāmi li-Aḫkām al-Qurʾān,10:351

[10]۔ الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر (م:۳۱۰ھ)، **جامع البیان في تأویل القرآن**، محقق: أحمد محمد شاکر، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۰ھ، ۱۷/۵۹۱

Al-Tabarī, Abw Jaʿfar Muhammad bin Jarīr, Jāmiʿ al-bayān an tāwīl Āy al-Qurʾān,Mwʾsasḥ al-Risalaḥ, 1420h, 17:591

[11]۔القرآن، طہ، ۲۰:۲۳

Al-Qurʾān, Tāḥa, 20:23

[12]۔ طٰہٰ،۲۰:۲۰

Al-Qurʾān, Tāḥa,20:20

[13]۔طٰہٰ،۲۰:۲۲

Al-Qurʾān, Tāḥa,20:22

[14]۔روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،۸/۴۹۴

Rwḥ al-Mʿānī fī tafsīr al-Qurʾān al-ʿẒīm w al-sabʿ al-maṯānī,8:494

[15]۔ أبو حیان الاندلسی، محمد بن یوسف (م:۷۴۵ھ)، **البحر المحیط فی التفسیر**، محقق: صدقی محمد جمیل، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۴۲۰ھ، ۳۲۶/۷

Abw Ḥayyān al-Andalusī, Muḥammad bin Yūsuf, Al-baḥr al-Muḥīṭ fī al-tafsīr,Dār al-fikar, Beirūt, 1420h, 7:326

[16]۔البحر المحیط،۳۲۶/۷

Al-baḥr al-Muḥīṭ fī al-tafsīr,7:326

[17]۔القرآن، الشمس،۹۱:۱۲۔۱۵

Al-Qurʾān, Al-Šmas, 91:12-15

[18]۔روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،۱۵/۳۶۳

Rwḥ al-Mʿānī fī tafsīr al-Qurʾān al-ʿẒīm w al-sabʿ al-maṯānī,15:363

[19]۔الجامع لاحکام القرآن،۲۰/۸۰

Al-Jāmi li-Aḫkām al-Qurʾān, 20:80